رمزؔ عظیم آبادی: حیات و شعری جہات

زبیر احمد بھاگلپوری

اردو سیکشن، بہار قانون ساز، کونسل، پٹنہ (بہار)، موبائل: 9334899643

تخلیق کا شدت جذبات اور نزاکت احساسات سے معمور ہونا فنکار کی معتبریت کا ضامن نہیں، ان اختصاصات سے تو وہ فطرتاً معمور ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کے لیے تخلیقات میں ندرت خیال کے اشتمال کا سوال ہے، متقدمین نے موجودہ نسل کے لیے اس کے امکانات بھی کم ہی چھوڑے ہیں۔ بایں صورت طرز تلازمہ (Dictional style) اور ترسیلیت (Communicability) کی اساس پر ہی کسی تخلیق کی فنی عظمت کی قدر شناسی کی جاسکتی ہے۔ دبستان عظیم آباد کے ایک نابغۂ ادب رمزؔ عظیم آبادی کی سخنوری کے حوالے سے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ متذکرہ پیمانوں کی بنیاد پر ان کی فکر وفن کی مکمل منطقی تفہیم کی ہنوز سعی نہیں کی گئی۔ اس کے پس پردہ کارفرما عوامل میں اردو ادب کی غیر منصفانہ انتقادی روش اور تقاضۂ حال کے مطابق تخلیقی پروجکشن میں منفی ادبی ماحول کے سبب رمزؔ کی پسماندگی اہم قرار دی جاسکتی ہے۔

آسودگی ایک سنجیدہ تخلیق کے معرض وجود میں آنے کی ایک محرک تو ہوسکتی ہے، شرط لازم قرار نہیں دی جاسکتی۔ بسا اوقات تخلیق کار کی تشنہ لبی ہی پرورش لوح وقلم کے لیے اسے مہمیز کرتے ہوئے ایک ایسے میکدے کی تشکیل کا سبب بن جاتی ہے جو دیگر ہزاروں تشنہ کاموں کی سیرابی کا وسیلہ بن جاتا ہے، لیکن شدت تشنگی برداشت کرتے ہوئے ثابت قدمی کے ساتھ جادۂ تخلیق پر تاحیات گامزن رہنا ہر فنکار کے بس کی بات نہیں۔ رمزؔ عظیم آبادی کا شمار انہی چند تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہیں دوران سفر چلچلاتی دھوپ کے درمیان نہ کبھی کسی ابر کے ٹکڑے کا سایہ نصیب ہوا، نہ کبھی کسی گھنے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں سانس لینے کی مہلت ہی ملی۔

گزشتہ صدی میں ۷۰ کی دہائی کے بعد دبستان عظیم آباد کی جو شعری و تخلیقی تثلیث ابھر کر سامنے آتی ہے اس میں کلیم عاجز اور مظہر امام کے ساتھ رمزؔ عظیم آبادی جیسے گل سرسبد کا نام بھی آتا ہے، جن کی پیدائش جون ۱۹۱۴ء میں سنارٹولی، پٹنہ سٹی، بہار میں ہوئی۔ اس عظیم فنکار کے تولد کا مہینہ تو معلوم ہے، لیکن تلاش بسیار کے باوجود تاریخ تولد ہنوز دریافت نہیں ہوسکی۔ اس کی معقول وجہ یہ ہے کہ رمزؔ کی پیدائش معاشرے کے ایسے پست ترین کنبے میں ہوئی جہاں عموماً تاریخ پیدائش ضبط تحریر میں لانے کا کوئی تصور بھی نہیں کرتا۔

رمزؔ کی ابتدائی تعلیم کے حوالے سے ان کے معاصرین سے موصولہ روایت کے مطابق اردو پرائمری اسکول، گلزار باغ، پٹنہ میں ان کا داخلہ ہوا تھا، لیکن اس کی بھی کوئی تحریری دستاویزی شہادت موصول نہیں۔ داخلہ مان بھی لیا جائے تو طے شدہ امر یہ ہے کہ چند دنوں یا مہینوں کے بعد ہی اقتصادی تنگ دستی اور حالات کی ناسازگاری کے سبب انہیں ڈراپ آؤٹ کا شکار ہونا پڑا۔ رمزؔ عظیم آبادی کی حیات اور ادبی خدمات کے حوالے سے معلومات کا جو واحد ماخذ ہے وہ ادارہ 'سلسلہ' پٹنہ کے زیر اہتمام شائع کتاب ''رمزؔ عظیم آبادی -شخصیت اور فن'' ہے جن کے بیشتر مقالے ان کے معاصرین کی یادداشتوں پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب کے مطابق رمزؔ نے ذاتی دلچسپی دکھاتے ہوئے اپنے دوست اور شعری استاد جناب منظر عظیم آبادی سے اردو زبان سیکھی۔ باضابطہ تعلیم نہ کسی اسکول سے اور نہ کسی مدرسے سے حاصل کر سکے تاہم مطالعے کا شوق تا حیات ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ معاشی تنگ حالی میں بھی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ جاری رہا۔ باعث استعجاب امر یہ ہے کہ جو رمزؔ اپنی تنگ حالی کے سبب کسی ادارے میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے، زمانے نے دیکھا کہ وہی رمزؔ ایک دن ایک ایسا ادبی وتخلیقی ادارہ بن کر سامنے آئے جس سے شعر وسخن کے سیکڑوں تشنگان سیراب ہوئے۔ اسی لیے میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ رمزؔ کی عظمت کا راز اس کے ایک عظیم شاعر ہونے سے زیادہ ایک عظیم تخلیقی وفنی استاد ہونے میں مضمر ہے۔

پٹنہ سٹی واقع 'نواب منزل' کے نام سے موسوم نواب سید مصطفیٰ علی خان کی جس حویلی سے رمزؔ کی والدہ کام کے سلسلے میں برسوں تک وابستہ رہیں، اسی حویلی میں رمزؔ کی پیدائش ہوئی۔ بچپن میں حویلی کے مکینوں کے ماحول اور سرپرستی کا رمزؔ کی مزاج سازی میں بہت عمل دخل رہا، لیکن شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نوابی خانوادوں سے رشتہ منقطع ہوگیا۔ شاید اس قطع تعلق میں رمزؔ کی خودداری اور انا پرست طبیعت کا دخل رہا ہو۔

رمضان کے مہینے میں پڑھے جانے والے سحر ناموں میں شرکت نے ادبی رجحان سازی کے لیے تخم ریزی کا کام کیا۔ اسی ماہ مبارک کے نام سے

لوگ 'رمضانی' کہنے لگے۔ ان کے دوست اور ادبی استاد منظر عظیم آبادی کے مشورے سے نام 'رضا علی خان' اور تخلص 'رمزؔ' پڑا۔ کچھ اور ہوش سنبھالا تو 'محمڈن اینگلو عربک اسکول' پٹنہ سٹی کی ادبی تنظیم 'یاران میکدہ' کے پروگراموں میں شرکت نے ان کے اندر کی ادبی تشنگی کو جلا بخشی، لیکن معاشی تنگی کی چلچلاتی دھوپ نے یہاں بھی انہیں سکون سے شعر وسخن کی تربیت کا موقع نہیں دیا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جب فکر معاش شدید تر ہوگئی تو رکشہ کھینچنے لگے۔ جب اس سے بھی کام نہ چلا تو قوالوں کے لیے کلام لکھنے لگے۔ قوالوں کے لیے جو انھوں نے کسب معاش کے لیے قوالیاں لکھی ہیں، ان کی تعداد لاکھوں میں ہے جن میں سے چند کے نمونے متذکرہ کتاب میں بھی درج ہیں۔ زندگی کی راہ جب اور کٹھن ہوگئی تو تلاش معاش میں کلکتہ چلے گئے جہاں یوسف آزاد، حافظ نابینا، پنالال بوس، رستم قوال، ثریا پروین، طلعت بانو اور پنڈت شیو بالک جیسے قوالوں کی دھوم مچی رہتی۔ یہاں ان قوالوں کے لیے کلام کی سپلائی رمزؔ کا اہم ترین وسیلۂ معاش رہا۔ قیام کلکتہ کے ابتدائی دنوں میں کئی ہوٹلوں میں بھی کام کرنا پڑا۔ اس دوران کلکتہ اور پٹنہ کے درمیان ان کے آنے جانے کا سلسلہ قائم رہا۔

قیام کلکتہ کے دوران رمزؔ کو تین بیش قیمت چیزیں ملیں جنھوں نے شعر و سخن کی پرورش کے لیے خام مواد فراہم کرنے کا کام کیا۔ ان میں پہلی لائبریری، دوسری پرویز شاہدی اور تیسری راہل سانکرتیاین۔ ۱۹۵۶ء میں جب رمزؔ کلکتہ سے پٹنہ لوٹے تو پھر لوٹ کر کلکتہ جانے کی نوبت نہیں آئی۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ بہار شری کرشن سنگھ بھی رمزؔ کی شاعری سے اب تک متاثر ہو چکے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ پرویز شاہدی کی طرح بہار کا ایک اور چمکتا ستارہ معاشی مسئلے کے سبب ریاست چھوڑ کر چلا جائے۔ بالآخر اس وقت کے وزیر جیل عبدالقیوم انصاری نے کسی اسکول سے ساتویں یا آٹھویں کی سند خود نکلوا کر انہیں محکمہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں فورتھ گریڈ کی ملازمت فراہم کرائی۔ یہ ملازمت ہی دراصل رمزؔ کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئی کیوں کہ اس کے بعد ہی ان کے تخلیقی وفکری عمل میں سنجیدگی آسکی۔

رمزؔ پر دوہری افتاد یہ پڑی کہ گردش حالات کے علاوہ ان کے ایک مجموعۂ کلام کا مسودہ ان کے کسی قریبی نے اڑا دیا جس کی ٹیس وہ زندگی کے آخری ایام تک محسوس کرتے رہے۔ (بحوالہ رمزؔ عظیم آبادی۔ شخصیت اور فن)۔ موجودہ دو دواوین میں 'نغمۂ سنگ' اور 'شاخ زیتون' شامل ہیں۔ اول الذکر ۴۲ نظموں اور ۲۷ غزلوں اور مؤخر الذکر ۱۲ نظموں اور ۴۳ غزلوں پر مشتمل ہے۔ علمائے انتقادیات کے درمیان یہ امر مختلف فیہ ہے کہ رمزؔ بطور نظم نگار عظیم تر تھے یا بحیثیت غزل گو۔ ان کی نظموں کا کلاسیکی رچاؤ اور موضوعاتی معنویت قاری کو جتنا حظ بہم کرتی ہے، ان کی غزلوں کے لہجے کا کھرا پن اور بیانیہ کی سحر طرازی اتنی ہی انبساط انگیز ہے۔

۱۹۱۷ء میں راج کمار شکل کی دعوت پر چمپارن (بہار) پہنچے بابائے قوم گاندھی جی کے ذریعہ چھیڑے گئے 'ستیہ گرہ' کے ساتھ ہی جنگ آزادی کے فیصلہ کن مرحلے کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی انھیں بہر جانب جنگ کے بگل کی صدائیں نہ صرف سنائی دیتی تھیں بلکہ ان کے حساس دل و دماغ کو گہرے طور پر متاثر بھی کرتی تھیں، لیکن کھیلنے کی عمر میں ہی اپنے نازک شانے پر بار دنیاداری اٹھانے والے مفلوک الحال نوجوان کو تحریک آزادی میں شرکت کی مہلت کہاں تھی:

کھیلنے کی عمر میں ہی دنیاداری سیکھ لی
جانے کب رخصت مرا معصوم بچپن ہو گیا

عدم شرکت کے باوجود تحریک آزادی کی آنچ رمزؔ کے حساس ذہن کو حرارت بخشنے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے تار و پود کے تشکیلی محرک کے طور پر یقیناً کام کر رہی تھی جس کے نقوش کا مشاہدہ ان کی وطنیہ نظموں سے واضح طور پر کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں شائع ان کے اولین مجموعۂ کلام 'نغمۂ سنگ' کی نظمیں 'چھبیس جنوری'، 'سفیر بہار'، 'عہد و پیمان'، 'برف میں پھول کھلے'، 'شام وطن' اور ۱۹۹۸ء میں شائع 'شاخ زیتون' کی نظمیں 'پاسداران وطن' اور 'تاریخ کی آواز' ایسی ہی نظمیں ہیں جو تحریک آزادی سے تخلیق کار کی اثر پذیری کے نتیجے میں زیور خلق سے آراستہ ہونے کی بین شہادت پیش کرتی ہیں، تاہم ان کی فنکاری کے محاکے کے نتیجے میں جو حقیقت منتج ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کے جہان شعری کی تعمیر کا حقیقی محرک حالات کی وہ ستم ظریفی بنی جوان کے ساتھ ''گود سے گور تک'' گئی۔

باعتبار لہجہ ان کی فنکاری پر 'کلاسیکیت' اور 'جدیدیت' جیسے ادبی رجحانات کے اثرات واضح طور پر محسوس کئے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے وہاب اشرفی کا یہ نظریہ مبنی برحقیقت ہے کہ ''رمزؔ جہاں اپنے کلاسیکی مزاج کا پتہ دیتے ہیں، وہیں جدید حسیت ان کی میراث ہے۔ یہ صورتیں نظم میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور غزل میں بھی۔'' فرق صرف اتنا ہے کہ ان کی سخنوری پر، 'جدیدیت'، کی بہ نسبت 'کلاسیکیت'، کا رنگ نمایاں تر ہے۔ طرز سخن کی اس بوقلمونی سے مترشح ہے کہ رمزؔ کی تخلیق کاری عملاً کسی بھی ادبی رجحان کی اصولی پابندیوں سے آزاد رہی۔ ان کا فوکس طرز اظہار کے بجائے مقصد اظہار پر رہا۔ جدیدیت کی خارجی لسانیاتی تازہ کاری جوان کے لہجے پر نظر آتی ہے، وہ کسی 'ازم' کی تقلید کے سبب نہیں بلکہ ان کے فطری غیر شعوری برتاؤ کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے داخلی معنوی اسلوب اظہار پر جدیدیت کا اثر صفر دکھائی دیتا ہے اور ان کی فکری ترسیلیت میں رمزیت، سریت، اشاریت اور کنائیت جیسے جدیدی اختصاصات کا شائبہ دور دور تک نظر نہیں آتا۔ مشتے

نمونہ ازخروارے:

عریاں ہے بدن لوگوں کا شیشوں کے مکاں میں
سورج کو کوئی شہر میں آنے نہیں دیتا!!

ہوا دریچے سے کمرے میں گرد پھینک گئی
مرے جنوں کو ملا دعوتِ سفر گھر میں

میرؔ سے لے کر کلیم عاجزؔ تک گردش ایام کی زد میں آ کر پیچ وتاب کھانے والے شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جن کی آپ بیتی جگ بیتی بن گئی۔ درد، کرب اور سوز کا مؤثر اظہار ان اساتذۂ فن کے کلام میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، لیکن اچھوتے اسلوب بیان کے سبب جو شدت، چبھن، سحر انگیزی اور Touching elements رمزؔ کی شاعری میں پائے جاتے ہیں، وہ نہ صرف انھیں فنکاروں کے ازدہام میں انفرادی شناخت عطا کرتے ہیں بلکہ ارباب نقد ونظر کو چونکاتے بھی ہیں۔ ان کرب آگیں اشعار کا ایک امتیاز یہ ہے کہ ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے تخلیقی لب ولہجے پر کلاسیکی رنگ وآہنگ کس حد تک غالب ہیں:

اشکوں کے سوا کچھ نہ ملا دست طلب میں
کب کی تھی مسرت کی دعا یاد نہیں ہے

ہمت شکن تھا جادۂ ہستی کا ہر اک گام
میرا یہ حوصلہ کہ گرے اور سنبھل گئے

ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں تخلیقی افق پر ابھرنے والے بیشتر شعرائے کرام کے فن پاروں سے جو صدائے احتجاج ابھرتی ہے، وہ رمزؔ تک آتے آتے بلند تر ہو جاتی ہے۔ جوشؔ ہوں یا فراقؔ، فیضؔ ہوں یا احمد فرازؔ تقریباً سب کے یہاں استبدادی نظام زندگی کے خلاف باغیانہ تصور کا وجود ہے، لیکن دیگر شعرا اور رمزؔ کے احتجاجی تیور کے درمیان جو ایک امتیازی لکیر کھنچی نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ دیگر شعرا کا پروٹسٹ خصوصاً ''سیاست رخی'' ہے جبکہ مؤخر الذکر کا اس استحصال پسند معاشرے کے خلاف ہے جس کا شکار ذاتی اور عملی طور پر وہ خود ہوئے۔

موضوع کو ذاتی ہونے کے باوجود کائناتی بنا دینا کمال فن کی علامت ہے۔ دیگر عظیم شعرا کی مانند رمزؔ نے بھی بشکل احتجاج اپنے آنسوؤں سے جس ذاتی اضطراب کو اوراق فن پر رقم کیا، وہ 'غم جانان' نہ رہ کر 'غم دوراں' بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مطالعے سے گزرنے والے ہر قاری کو وہ اپنا محسوس ہوتا ہے۔ یہی انفرادر رمزؔ کو آفاقی عظمت کے متحمل فنکاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ دو مثالیں:

مجھے رلاتے ہو لیکن وہ وقت آئے گا
ہنسو تو ہنستے رہو وہ عذاب ہم دیں گے

ہر آدمی کو یہاں دعویٰ خدائی ہے
اکیلی جان ہے کس کس کا احترام کرے

یہ آگ تو کسی کو بھی پہچانتی نہیں
جلتے ہوئے گھروں کا تماشہ نہ دیکھئے

تخلیق میں داخلی کوائف کی عکاسی تخلیق کار کی Genuineness کا مظہر اور اس کی فطری تخلیقیت کا غماز ہوتی ہے۔ داخلیت کے کیف وکم کا راست اثر تخلیقی مزاج ومنہاج اور معیار واقدار کی تشکیل پر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی تخلیق کی کنہیات کی مکمل تفہیم کے لیے تخلیق کار کے ذاتی حالات کے نشیب وفراز کا جائزہ لازمی ہوتا ہے۔ رمزؔ کے فنی معائب ومحاسن کی تنقیح کے پیشتر ان کے ان نجی حالات سے آگہی لازمی ہے جو حقیقتاً ان کے تخلیقی ایوان کی اساس بنے۔

رمزؔ کو محنت کش طبقہ کا نمائندہ شاعر قرار دینے والوں میں سب سے پہلا نام پروفیسر مختار الدین آرزو کا ہے۔ اس حوالے سے وہ رقمطراز ہیں:

''رمزؔ عظیم آبادی ایک غیر مبہم نقطۂ نظر کے مالک ہیں اور اپنے شعروں کے ذریعہ ایک واضح پیغام قارئین تک پہنچانا ان کا مقصد رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ دبے اور کچلے ہوئے محنت کش کو بیدار ہونے اور اپنا حق بزور بازو حاصل کرنے کا درس دیتے ہیں تو دوسری طرف عام لوگوں کے دلوں میں اس طبقے کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں، لیکن جو بات خاص طور پر قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ رمزؔ اپنے پیغام کو پروپیگنڈہ نہیں بننے دیتے۔'' پروفیسر مختار الدین کا نظریہ رمزؔ کی شاعری کے حوالے سے اپنی جگہ درست ہے، لیکن رمزؔ کی شعری وفکری کائنات کا دائرہ اس سے وسیع تر ہے۔

غزلوں کی مانند رمزؔ کی نظموں میں بھی موجود لسانی سلاست، روانی اور تشکیلاتی تازہ کاری کے ساتھ ساتھ مربوط فکری ترسیلیت ان کی نظمیہ شاعری کو وقار وتمکنت عطا کرتی ہیں یعنی داخلی اور خارجی دونوں سطح پر فنی تقاضے کے حوالے سے ان کی شاعری افراط وتفریط سے پاک رہی ہے۔ جہاں تک ان کی نظمیہ شاعری میں طبقاتی ترجیحات کا سوال ہے، پرولتاریہ سے ذاتی وعملی رشتے کے سبب ورکنگ کلاس کی نمائندگی قدرے زیادہ ضرور نظر آتی ہے، لیکن ایسا بھی نہیں کہ باعتبار موضوع ان کا فکری وفنی کینوس صرف محنت کش طبقہ کی پیکر تراشی تک محدود ہے، ان کی تخلیق میں متنوع رنگ وآہنگ اور مختلف مزاج و مذاق کے عناصر موجود ہیں۔ ان کا جہان سخن کثیر الابعاد (Multi dimensional) ہے جن میں سے ایک اثر دار Dimension محنت

کشوں کی زندگی کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنی جن نظموں کے توسط سے معاشرے کے استحصال زدہ طبقہ کی دلدوز عکاسی (Imagery) کی ہے، ان میں 'نقش دوام'، 'زندگی'، 'صبح تمنا'، 'برف کا شعلہ'، 'چاند کو چھونے کا قصہ' اور 'صنم وحرم' وغیرہ کو اعتبار حاصل ہے۔ چند نمونے:

'چاند کو چھونے کا قصہ'

سوچتا ہوں اس ترقی کا نہ یہ انجام ہو
چاند کی کرنیں ہوں زہریلی، بھیانک شام ہو
آدمی کی بربریت کا فسانہ عام ہو
انجم و گیتی کا پیمان وفا بدنام ہو
وسعت جلوہ سمٹ جائے، زمیں رسوا نہ ہو
چاند دو ٹکڑوں میں بٹ جائے کہیں ایسا نہ ہو

'نقش دوام'

تاج ہے محنت کشوں کی یادگار
فکر کی جنت، مشقت کا وقار
کتنی پیشانی کا درّ شاہوار
علم و صنعت کا حسیں آئینہ دار
یہ مرقع ہے کسی کے پیار کا
تاج پر حق ہے مگر فنکار کا

ان کی نظموں کا معتد بہ حصہ وطنی شاعری پر مشتمل ہے۔ ہمارا ملک برطانوی تسلط سے یوں تو رمزؔ کی شعر گوئی کے باضابطہ آغاز (۱۹۴۹ء) سے قبل ہی ۱۹۴۷ء میں آزاد ہو چکا تھا، لیکن تحریک آزادی رمزؔ کے فطرت شناس ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنے اثرات مرتب کر رہی تھی جس کی شہادت وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ان کی درجنوں نظموں سے ملتی ہے۔ وطنیت کی آب و ہوا ۱۹۴۷ء کے بعد بھی کئی برسوں تک وطنی شعرا کو تخلیقی توانائی فراہم کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ رمزؔ کے علاوہ بھی کئی شعرا نے آزادی کے بعد حب الوطنی پر مبنی نظموں کی شکل میں اردو کے شعری سرمائے میں خاطر خواہ اضافے کئے۔ فیض احمد فیض سے لے کر کلیم عاجزؔ تک درجنوں شعرا نے آزادی کے بعد خالص وطن پرستی کا بھرپور اظہار شعری پیکر میں کیا ہے۔ رمزؔ کی وطنی شاعری کا نمونہ دیکھیں:

'شام وطن'

رقص بہار توبہ شکن دیکھتے چلو
حسن نگار سروسمن دیکھتے چلو
پندرہ اگست جشن چراغاں ہے چار سو
کتنی حسیں ہے شام وطن دیکھتے چلو
ہم سربکف ہیں ملک کی خدمت کے واسطے
ناموس حریت کی حفاظت کے واسطے

بیشتر ارباب نقد ونظر نے رمزؔ کو مزدور اور محنت کش طبقہ کا شاعر گردانا ہے، لیکن پروفیسر عبدالمغنی کا نظریہ ان کے فکر وفن کے حوالے سے قدرے مختلف ہے۔ وہ رمزؔ کو احسان دانش کے بعد سماج کے پرولتاریہ کا سب سے بڑا شاعر تو قرار دیتے ہیں، ساتھ ہی وہ ان کی نظمیہ شاعری کی ایک نئی پرت اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''رمزؔ کو لوگ اشتراکی ترقی پسند سمجھتے ہیں، لیکن ان کے دوسرے مجموعۂ کلام کی جو نظمیں میرے سامنے ہیں، ان میں چند موضوعات یہ ہیں۔ 'معراج'، 'طلوع اسلام'، 'رحمت'، 'جز ووکل'، 'جلوہ ہی جلوہ'۔ ظاہر ہے یہ سب اسلامی موضوعات ہیں اور نعتیہ کلام کے نمونے۔ ان سے رمزؔ کی اسلام پسندی اور حب رسولؐ نمایاں ہے''۔ مذہبی رنگ کی متحمل یہ نظمیں پروفیسر عبدالمغنی کی ادعائیت کی توثیق تو کرتی ہیں، لیکن اس حقیقت سے بھی اغماز ممکن نہیں کہ کسی بھی فنکار کی کارکردگی کا موضوعاتی تشخص اس کی تخلیقی کثرت میلان کی بنیاد پر، نہ کہ چند نمونوں کی اساس پر موزوں ہوگا۔ اس زاویے سے رمزؔ کا تخلیقاتی محاکمہ انہیں بجا طور پر محنت کش طبقے کا نمائندہ شاعر قرار دیتا ہے۔ ان کے فن پر چند نمونوں کی بنیاد پر اسلام پسندی کے لیبل کا انطباق قدرے غیر مناسب محسوس ہوتا ہے۔ تاہم یہ نظمیں، خواہ وہ باعتبار رنگ وموضوع مذہبی ہوں، ادبی معیار اور اس کے سارے تقاضے پر کھری اترتی ہیں مثلاً:

وہ جن کے جسم کی خوشبو ہے سرمایہ بہاروں کا
وہ جن کے زلف کا قصہ ترنم آبشاروں کا
وہ جن کی گردیا سے بڑھ گیا رتبہ ستاروں کا
سہارا آ گیا دنیا کے سارے بے سہاروں کا
نکلتا ہے جو سورج کے ترکش کے کام آتا ہے
شعاع مہر سے مٹی کا گھر بھی جگمگاتا ہے

(رحمت جز ووکل)

معتبر ارباب نقد نے رمزؔ کی شاعری کو قدر شناسی کے حوالے سے تاحیات لائق اعتنا تصور نہیں کیا، لیکن خود رمزؔ کو اپنی فنکاری کے تئیں اس بات کا یقین محکم تھا کہ نہ صرف یہ کہ آنے والی نسلیں مجھے فراموش نہیں کریں گی بلکہ میرے ذریعہ ایجاد کردہ طرز فغان گلستان ادب میں قابل تقلید ثابت ہوگا:

آنے والی نسلیں ہم کو بھول سکیں، ناممکن ہے
نقش قدم کے مٹتے مٹتے راہ گزر بن جائیں گے

◆◆◆